URDU STUDIES vol1 issue 1 2021 Pages 9-12

اداریہ

عصر حاضر کی علمی پیش رفتوں سے وابستہ عالمی اشتراک باہمی میں وسعت کی گوناگوں کیفیات نے اسے اپنی تمام تر جدید کاریوں کی وجہ سے ایسے امکانات فراہم کر دیے ہیں جن کا آج سے ایک دہائی قبل تک تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ڈیجیٹل رسائی کے سبب تحصیل علم ہی نہیں، اس کے درک و اخذ میں بھی انقلاب برپا ہوا ہے۔ اس کے باوجود مطبوعات کی اہمیت اپنی جگہ قائم ہے۔ کتابوں، جرائد، رسائل وغیرہ کی اشاعتیں آج متنوع صورتوں میں ہو رہی ہیں۔ اپنی طبعی خصوصیات کی وجہ سے یہ کتب و جرائد برقی اشاعتوں سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ ان سے قاری کا جو رشتہ قائم رہتا ہے وہ ڈیجیٹل اشاعتوں کے ساتھ ممکن نہیں ہے۔

عالمی طور پہ اردو زبان و ادب اور تہذیب کے مطالعات نے پچھلے پچاس سالوں میں ایک علمی شعبے کے طور پر اپنی منفرد شناخت قائم کر لی ہے۔ حالانکہ برصغیر کی دانش گاہوں میں اردو کے شعبے سکڑتے جا رہے ہیں، بین الاقوامی صورت حال یہ ہے کہ ایک مخصوص ثقافت کی زبان ہونے کی حیثیت سے اس میں دلچسپیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ ہمارے درمیان معاصر اسکالرز کی ایسی نسل موجود ہے جس کی تحقیق و تنقید میں اردو کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، حالانکہ خود اس کی زبان انگریزی ہے۔ اس ضمن میں یہ بھی قابل توجہ ہے کہ اردو کے ادبی کارناموں کے انگریزی ترجموں کو بین الاقوامی ناشرین سے بھی بہت فروغ ملا ہے۔

ہم ذولسانی، بلکہ کثیر لسانی عہد میں جی رہے ہیں۔ اردو مطالعات سے تعلق رکھنے والی معیاری اسکالرشپ کو یکجا کرنے کے لحاظ سے موجودہ جریدے کا ذولسانی فارمیٹ اسے محققین اور قارئین کی ایک وسیع دنیا تک پہنچانے میں معاون ہوا ہے۔ پیش نظر شمارے میں مواد و مشتملات کے اعتبار سے اردو اور انگریزی میں متوازن حصے موجود ہیں۔

اردو میں شامل کیے گئے مقالات و مضامین کی ابتدا، اردو کے بزرگ ترین اسکالرز میں سے ایک، ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی تحریر سے ہوتی ہے۔ پروفیسر آنند نے ڈاکٹر مشفق خواجہ کے ساتھ ایک ملاقات کی یادتازہ کی ہے۔ ان کے مضمون میں روزنامہ اور سفرنامہ کی روایتیں اپنائی گئی ہیں۔ دونوں ہی اصناف اردو میں کافی مقبول ہیں۔ اس کے بعد ہمارے پاس غالب کی لسانی اور فکری پیچیدگیوں سے لے کر عرفان صدیقی تک کی شاعری میں استعارے کی تنقیدی اہمیت پر فکر انگیز مضامین کی ایک کہکشاں موجود ہے۔ ڈاکٹر سرورالہدیٰ کا مضمون غالب کے سلسلے میں دو عظیم دانشوروں کی آرا کے تقابلی نظریہ پر مبنی ہے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد نے غالب کے تخلیقی مزاج کا مطالعہ ان کے ہم عصر مرزا رفیع سودا کی روشنی میں کیا تھا۔ کلیم الدین احمد کا خیال تھا کہ شاعر کی عظمت اس کے جذبات اور خیالات کو یکجا کرنے کی اس کی صلاحیت میں پنہاں ہوتی ہے۔ وہ غالب کی شاعری میں روانی کی کمی کے شاکی تھے۔ ان کا یہ بھی تصور تھا کہ غالب کے یہاں میر کی سی جذبات کی گہرائی نہیں ہے۔ وہیں، غالب سے متعلق شمس الرحمٰن فاروقی کا مطالعہ صرف متنی تجزیہ تک محدود نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سرورالہدیٰ کا استدلال ہے کہ فاروقی غالب سے متعلق چھوٹی چھوٹی تفصیلات پہ بھی نظر رکھا کرتے تھے، مثلاً غالب کے استاد عبدالصمد سے وابستہ تنازعے۔ فاروقی نے غالب کے تجسس اور بے چینی کو عصر غالب کی ہنگامی صورت حال اور ضرورتوں کے پس منظر میں بھی دیکھا ہے۔ سرورالہدیٰ نے واضح کیا ہے فاروقی کا تنقیدی طریقۂ کار کیونکر صرف متنی تجزیے تک ہی محدود نہیں تھا۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف کا علمی مضمون ہمیں ایک ایسے غیر مطبوعہ مخطوطہ سے متعارف کرواتا ہے جسے انھوں نے اوکسفرڈ کی بوڈلین لائبریری سے دریافت کیا تھا۔ یہ مخطوطہ انیسویں صدی کے اواخر کے معروف شاعر عبدالغفور نساخ کا مرتب کردہ تذکرہ ہے۔ نساخ کا یہ تذکرہ لکھنؤ کے خواجہ حیدر علی آتش کے کئی شاگردوں کے کوائف بیان کرتا ہے۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے اپنے فکر انگیز، علمی مقالے میں معنی کی تخلیق میں استعارے کے کردار پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے معاصر شاعروں کے یہاں استعارے کے استعمال کا کلاسیکی

شاعروں کے ساتھ موازنہ کرتے ہوئے یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ استعارہ بالآخر زبان میں سما جاتا ہے۔ جدیدیت پسند استعارے کا استعمال اپنے باطن میں دیکھنے اور اپنی انفرادی ذات کی جدوجہد کو پیش کرنے کے لیے کرتے ہیں جبکہ کلاسیکی ماہرین کے یہاں استعارے کو مابعدالطبیعیاتی تجرید کے لیے استعمال کیے جانے کی روایتیں ملتی ہیں۔

پروفیسر انیس الرحمٰن کا مضمون 'ہندوستانی ادب: تصور اور تناظر' اس لحاظ سے بہت ہی اہم ہے کہ اس میں ان پیچیدگیوں کی نشاندہی کی گئی ہے جو ہندوستانی ادب کی مجموعی شناخت قائم کرنے میں سدراہ ہیں۔ انھوں نے ہندوستانی ادب کو پڑھنے اور اس کی اثرپذیری کی نئی صورتوں کی جانب بھی اشارے کیے ہیں۔

جریدے میں انگریزی مضامین کا ایک حقیقی گلدستہ پیش کیا جا رہا ہے۔ خواجہ حسن نظامی کی 'کرشنا بیتی' کے مطالعہ پر مبنی پروفیسر مارسیا ہرمینسن کا مقالہ اس حصے کی اہم ترین تحریر ہے۔ چشتیہ سلسلہ کے صوفی خواجہ حسن نظامی اردو نثر کے سرخیل تھے۔ سوانح عمری، خود نوشت، اور روزنامچہ نویسی ایسی بعض اصناف ہیں جن میں ان کا اختراعی نثری انداز اپنے جلوے بکھیرتا نظر آتا ہے۔ پروفیسر ہرمینسن کی پیش کردہ تفصیلات کے مطابق خواجہ نظامی کی کرشنا بیتی دراصل برصغیر کے مشترکہ ہندو مسلم ثقافت کی ہم زیستی کو خراج تحسین پیش کرتی ہے۔ اس مقالے کا سب سے اہم وہ پہلو ہے جس میں رادھا اور کرشن کی محبت کے مابعدالطبیعیاتی رموز کی روشنی میں بانسری کو صوفیانہ تشبیہ سے ہم بست کرتے ہوئے قرأت کی نئی صورت وضع کی گئی ہے۔

ڈاکٹر فاطمہ رضوی صنفی مطالعات کے مختلف ابعاد پہ گہری نظر رکھتی ہیں اور ان موضوعات پہ تندہی سے باقاعدہ طور پہ کام بھی کر رہی ہیں۔ اردو جرائد اور اردو صحافت میں خواتین کی خدمات کے سلسلے میں ان کی تحریر اعلیٰ تحقیقی معیار کی حامل ہے۔ ڈاکٹر روزی لیویلین جونس نے ڈاکٹر فاخر حسین کی شخصیت اور اردو میں ان کے مطبوعہ تراجم کی اہمیت واضح کی ہے۔ لکھنؤ سے متعلق کچھ پروجیکٹس میں دونوں رفیق کار بھی رہ چکے تھے اس لیے ڈاکٹر فاخر حسین کے سلسلے میں ڈاکٹر روزی کی پیش کردہ یادداشتیں اہمیت رکھتی ہیں۔ پیشے سے نفسیاتی معالج ہونے کے باوجود حسین نے عالمی تنقیدی مباحث سے جڑے چند بہترین مضامین کا براہ راست انگریزی، اطالوی، المانی سے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ عبدالحلیم شرر کی کتاب 'گذشتہ لکھنؤ' کا ان کا ترجمہ آج بھی ایک حوالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ وِپن کرشنا کے مضمون '۱۹۳۰ کی دہائی میں لسانی انتشار کی نقشہ سازی: سلیمان ندوی اور ہندوستانی' میں اردو– ہندی– ہندوستانی کے پیچیدہ

تصوراتی تناظر میں نئی زمینوں کی تلاش کی سعی کی گئی ہے۔ کرشن چندر کے کلاسیکی ڈرامہ 'دروازے کھول دو' کا تجزیہ کرتے ہوئے صدیقہ فاطمہ نے اپنے مضمون میں کرشن چندر کی شاندار تخلیقی ذہانت کی نئی پرتیں اجاگر کی ہیں۔ زبان کے استحکام اور اس کی ترقی کے ساتھ ہی اسے پرکشش اور جاندار بنائے رکھنے کے لیے ترجمہ کاری کا عمل بہت ضروری ہے۔ ڈاکٹر حارث قدیر نے بلراج مین را کے مشہور مختصر افسانے کا انگریزی ترجمہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر امیت جلکا کے ذریعہ عظیم بیگ چغتائی کے افسانہ 'وکالت' کو انگریزی کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ خاکسار نے دیوان غالب کے پہلے شعر سے وابستہ شرحیات ومباحث کو اپنا موضوع بنایا ہے۔

اس شمارے کے اپنے تمام معاونین کا شکریہ مجھ پہ واجب ہے جنھوں نے مقالوں کی طلبی کے لیے اعلان کا مثبت جواب دیتے ہوئے اسے اپنی تحریروں سے مزین کرنے کا موقعہ فراہم کیا۔ میں پروفیسر ارشد مسعود ہاشمی کی بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے ادارت کے لیے مدعو کیا۔ یہ ہر لحاظ سے بہت ہی سود مند تجربہ رہا۔ ادارتی عمل میں تعاون کے لیے میں پروفیسر ہاشمی کے صبر وتحمل، توانائی اور تندہی کی معترف ہوں۔

ہمیں امید ہے کہ یہ شمارہ آپ کو پسند آئے گا۔ میری نیک خواہشات اس جریدے کے ساتھ ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ہے کہ اس کی اشاعت جاری رہے گی۔ ہمیں آپ کے ردعمل کا انتظار رہے گا۔

مہر افشاں فاروقی
شعبۂ مشرق وسطی وجنوب ایشیائی زبان وثقافت
یونیورسٹی اوف ورجینیا
ورجینیا، امریکہ